© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

گذشتہ ماہ جنوری کے بُرہان کے نظرات میں ضمنی طور پر رفاہِ عام کے اداروں کے فرقہ وارانہ (مثلاً ہندو، مسلمان وغیرہ) ناموں کی نسبت جو اظہارِ خیال کیا گیا تھا اُس سے بعض حضرات کو یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے کہ میں مسلم یونیورسٹی کے نام میں لفظ مسلم کو ناجائز سمجھتا ہوں، یا کم از کم اسے ناپسند کرتا ہوں۔ چنانچہ حیدرآباد کے ایک صاحب نے اس سلسلہ میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو ایک خط لکھا ہو اور مولانا نے اپنے نوٹ کے ساتھ اسے صدقِ جدید میں چھاپا ہو۔ اس لئے ضروری ہو کہ مذکورہ بالا نظرات میں فرقہ وارانہ ناموں کی نسبت جو کچھ سرسری اور ضمنی طور پر عرض کیا گیا تھا اُس کی وضاحت کردی جائے۔ تاکہ کسی غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے۔ پھر خواہ کسی صاحب کو میری رائے سے اختلاف ہو یا اتفاق! اس کاوش میں پڑنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

تعلیم گاہ، شفاخانہ، یتیم خانہ یا مسافرخانہ وغیرہ یہ سب رفاہِ عام کے کام ہیں جن کا تعلق انسان کی بنیادی ضرورت کی تکمیل سے ہو۔ اور جہانتک انسان کی بنیادی ضرورتوں کا تعلق ہو، اگر اللہ تعالےٰ نے جو رب العٰلمین ہو اُن کی تکمیل کے لئے جو چیزیں پیدا کی ہیں وہ سب انسانوں کے لئے یکساں اور برابر ہیں۔ اور اُن میں کسی فرقہ یا گروہ کا کوئی فرق و امتیاز ہرگز نہیں ہو، پھر حدیث میں سخی کو اللہ کا دوست کہا گیا ہو اور کسی کا دوست وہی ہوتا ہو جو اُس کے ساتھ مزاج اور طبیعت میں توافق رکھتا ہو۔ اس بنا پر اگر ایک شخص یا چند اشخاص ملکر رفاہِ عام کا کوئی ادارہ قائم کر رہے ہیں تو اللہ تعالےٰ کی شانِ رب العالمینی کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے اور انسانی برادری و مساوات کی قدرِ اعلیٰ کو بحال رکھنے کے لئے ضروری یہ ہو کہ اس ادارہ کا دروازہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لئے کھلا رہے اور اس سے استفادہ میں کسی خاص فرقہ یا مذہب سے تعلق رکھنے کی قید نہ ہو۔ پس اگر فرقہ وارانہ ناموں کا مقصد یہی ہے تو مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہو کہ یہ طرزِ عمل انسانی سماج کے لئے نہایت نامناسب اور نادرست ہے۔ اُس کی مثال بالکل ایسی ہو کہ آپ سخت گرمی اور لُو کے موسم میں پانی کی ایک سبیل لئے بیٹھے ہیں۔ لیکن چونکہ آپ نے اس سبیل کا نام "مسلم" یا "اسلامیہ" رکھا ہو اس لئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک غیر مسلم شدتِ عطش سے آپ کے سامنے تڑپ رہا ہو، مگر آپ اُس کو سبیل سے پانی کا ایک گلاس بھی نہیں دیتے۔ غور کیجئے! کیا یہ غیر انسانی حرکت نہیں ہو؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ مبارکہ تو یہ ہے کہ آپ نے دشمنانِ اسلام تک کو مسجد میں ٹھہرایا ہے اور یہودی لڑکے تک کی عیادت کرنے اُس کے گھر تشریف لے گئے ہیں۔

ہندوؤں نے چھوت چھات کی وجہ سے ایسے ادارے ضرور قائم کئے جو صرف ہندوؤں کے لئے۔ اور بعض بعض تو عام ہندوؤں کے لئے بھی نہیں بلکہ خاص خاص جاتی اور گوت کے لئے مخصوص ہوتے تھے لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اُن کی پوری تاریخ گواہ ہو کہ انھوں نے کبھی اپنے اداروں کو صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں رکھا۔ اُن کے مدرسوں میں مسلم اور غیر مسلم سب ایک ساتھ تعلیم پاتے تھے۔ مگر ہندوستان میں جب انگریزوں نے دونوں فرقوں میں تفریق پیدا کرنی چاہی تو اب دونوں کے تعلیمی ادارے بھی الگ الگ ہوگئے اور ایک کو دوسرے کے ادارہ میں داخلہ لینا قانوناً ممنوع ہوگیا چنانچہ اب تک کلکتہ کے مدرسہ عالیہ کے کالج میں یا ہائی اسکول میں کوئی غیر مسلم داخلہ نہیں لے سکتا اور اسی طرح کلکتہ کے سنسکرت کالج میں کوئی غیر ہندو داخل نہیں ہوسکتا۔ یہ کس درجہ افسوسناک صورتِ حال ہو؟ یعنی اگر ایک ہندو اسلامی علوم وفنون کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہو یا ایک مسلمان سنسکرت اور ہندو فلسفہ و مذہب کا مطالعہ کرنا چاہتا ہو تو کلکتہ جیسے عظیم شہر میں ان دونوں کے لئے کوئی بندوبست نہیں۔

لیکن اس پر قیاس کر کے جیسا کہ "صدقِ جدید" کے لائق مراسلہ نگار نے کیا ہو، میری طرف یہ منسوب کرنا کہ میں مسلم یونیورسٹی کے نام میں "مسلم" کا لفظ مناسب نہیں سمجھتا بالکل غلط اور نادرست ہو کیونکہ مسلم یونیورسٹی اس معنی میں مسلم یونیورسٹی کبھی نہیں بنی کہ یہاں غیر مسلم تعلیم پا ہی نہیں سکتے، اس یونیورسٹی کو مسلم اور بنارس یونیورسٹی کو ہندو کہنے کی وجہ اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو کہ یہ دونوں ادارے علی الترتیب اسلامی اور ہندو تہذیب و ثقافت کے نمائندہ ہیں اور چونکہ دنیا کی کوئی تہذیب و ثقافت بھی کسی خاص فرقہ یا گروہ کی اجارہ داری نہیں ہوتی اس بنا پر کسی ادارہ کا نام کسی تہذیب کی مناسبت سے رکھنا اور اُس ادارہ کو اس تہذیب سے مخصوص کرنا نہ فرقہ پروری ہو نہ انسانیت اور جمہوریت کے کسی تقاضہ کے خلاف ہو اور نہ اس سے انسانی برادری اور مساوات پر کوئی حرف آتا ہو اور صرف یہی نہیں بلکہ حق یہ ہے کہ ایک ایسے ملک میں جو مختلف تہذیبوں کا گھر ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عام سیکولر اداروں کے ساتھ کچھ ادارے ایسے ضرور ہونے چاہئیں جو انفرادی طور پر کسی ایک تہذیب کا مرکز ہوں تاکہ اس طرح ملک کی ہر تہذیب کو پھولنے پھلنے اور اپنے مخصوص جوہر کو پروان چڑھانے کا موقع ملے۔ یورپ اور امریکہ کی متعدد یونیورسٹیاں اس کی مثال میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

چنانچہ ایک مرتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے حالات بہت مایوس کن ہو گئے اور اس سلسلہ میں ایک مشاورتی جلسہ دہلی میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مکان پر ہوا تو اس میں سیٹھ جمنا لال بجاج نے حکیم اجمل خانصاحب کو خطاب کر کے کہا "حکیم صاحب! اگر آپ جامعہ کے نام سے ملیہ اسلامیہ کے الفاظ نکال دیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ جامعہ کیلئے لاکھ دو لاکھ روپیہ ہندوؤں سے ہی لا دوں گا۔" گاندھی جی جو اس مجلس میں تکیہ کا سہارا لئے بیٹھے تھے یہ سنتے ہی سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا "اس جامعہ کا نام ملیہ اسلامیہ تو خود میں نے رکھوایا ہے اور اس لئے کہ یہ درسگاہ اسلامی تہذیب و کلچر کی تعلیم گاہ ہوگی، اسلامی تہذیب کا مطالعہ غیر مسلموں کو بھی کرنا چاہیئے۔ میں اپنے لڑکے دیوی داس کو اگر اس کی تعلیم دلانا چاہوں تو آخر اسے کہاں بھیجوں؟ ایک درسگاہ تو کم از کم ایسی ہونی چاہیئے۔" اس کے بعد حکیم صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا "حکیم صاحب جامعہ کے نام سے یہ الفاظ کبھی نہ نکالئے اور میں اسی نام سے اس کے لئے ہندوؤں سے آپ کو روپیہ لا کر دوں گا۔" یہ واقعہ میں نے سب سے پہلے شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی مرحوم سے سنا تھا اور جب ۱۹۴۷ء میں ایک دن دوپہر کے وقت مولانا ابوالکلام آزاد سے اُن کی کوٹھی پر میں نے یہ واقعہ بیان کیا تو مولانا نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے جو اس مجلس میں اور چند حضرات کے ساتھ موجود تھے اس واقعہ کی تصدیق چاہی، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "جی ہاں! شفیق صاحب نے بیان تو مجھ سے بھی کیا ہے۔"

علاوہ ازیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ دنیا میں کوئی عام اخلاقی اصول ایسا نہیں ہوتا جس میں حالات کی مجبوری کی وجہ سے تغیر و تبدل نہ کرنا پڑتا ہو۔ مثلاً ایک اخلاقی اصول یہ ہے کہ والدین کو سب بچوں کے ساتھ یکساں معاملہ کرنا چاہیئے! لیکن اگر ایک بچہ بیمار اور کمزور ہے تو اب لامحالہ والدین کا فرض ہو جاتا ہے کہ اس بچہ کی نگرانی اور دیکھ بھال زیادہ کریں، پس اسی طرح ملک کا اگر کوئی طبقہ پسماندہ اور ضعیف ہے اور اس کو اُٹھانے اور دوسرے ترقی یافتہ طبقات کے برابر لانے کی غرض سے کوئی ادارہ پسماندہ طبقہ کی ہی تعلیم کا انتظام کرتا ہے، یا کسی مشترک تعلیم گاہ میں اس طبقہ کے لئے تعداد مقرر کر دیتا ہے تو اسے بھی فرقہ واریت نہیں کہا جا سکتا۔

جنوری کے نظرات میں جمہوریت اور اُس کے عام تقاضوں کا تذکرہ کر کے لکھا گیا تھا کہ ان حالات میں مسلمانوں کو اپنے سوچنے اور غور کرنے کا ڈھنگ بدلنا چاہیئے، اور ظاہر ہے اس سلسلہ میں ایک عام اخلاقی اصول کا ہی ذکر ہو سکتا تھا۔ مراسلہ نگار اگر فرقہ وارانہ ناموں والے جملہ کو سیاق و سباق کے ساتھ ملا کر پڑھتے تو انھیں مغالطہ نہ ہوتا۔ لیکن انگریز ہمارا جو ذہن اور مزاج بنا گیا ہے ابھی بدلتے بدلتے بھی لمبے برسوں لگیں گے۔ اللّٰھم احفظنا من شرور انفسنا۔

© rasailojaraid.com